مرزا سلیم بیگ:

سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو"

رام بابو سکسینہ کی " ہسٹری آف اردو لٹریچر " ۱۹۲۷ء میں پہلی بار الہ آباد سے شائع ہوئی ، پھر " تاریخ ادب اردو " کے نام سے اس کا ترجمہ ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس کے مترجم مرزا محمد عسکری تھے۔

بقول مترجم (مرزا محمد عسکری) "اس (انگریزی تصنیف) سے سے زیادہ تر غرض یہ تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اس سے مستفیض ہو"۔۱

وہ اپنے "التماس مترجم" میں مزید رقم طراز ہیں:

"فاضل مصنف نے اصل کتاب کی ترتیب میں اسی روش کا خیال رکھا ہے جو ادبِ انگریزی کے مشہور مورخین پروفیسر سینٹس بری اور گاس وغیرہ نے اپنی تصانیف میں اختیار کی ہے جس سے علاوہ جدتِ ترتیب اور مخصوص اسلوبِ بیان کے یہ فائدہ بھی ہوا کہ کتاب ان اصحاب کے واسطے بہت مفید ہوگئی جنھوں نے بی، اے یا ایم، اے کی ڈگری یا آئی، سی، ایس کے واسطے ادبِ اردو لے لیا ہو۔ جس قدر

۱- رام بابو سکسینہ : "تاریخ ادب اردو"، مترجم مرزا محمد عسکری، (التماس مترجم)، لکھنؤ، نول کشور پریس، ۱۹۲۹ء، ص ۲۷-

سوالات کہ امتحانِ مذکور میں پوچھے جاسکتے ہیں
وہ سب اس کتاب کے مطالعے سے بہ خوبی اور بہ آسانی
حل ہوسکتے ہیں اور ترتیبِ مضامین خود سوالات
بنانے میں بھی بہت معین ہوگی"۔۱

اس سلسلے میں اگر مصنف کی اصلی غرض یہی تھی تو یہ کہنا پڑے گا کہ وہ اپنے اس مقصد میں بہت کامیاب رہے ہیں ان کی کامیابی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی کہ یہ کتاب اشاعت کے بعد سے اب تک بالواسطہ ٹیکسٹ بک شمار ہو رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ کتاب امتحانی ضروریات کے پیشِ نظر لکھی گئی، لیکن اس کی تصنیف میں مصنف نے جس تاریخی شعور کا ثبوت دیا ہے، اس سے ادبی تاریخ نویسی کے بارے میں مصنف کے تصورات بہ خوبی واضح ہوجاتے ہیں، جن کی صراحت "تمہید" میں وہ یوں کرتے ہیں:

الف۔ اردو ادب کی تدریجی ترقی کا خاکہ زمانۂ قدیم سے لے کر زمانۂ حال کا مع مشہور شعراء اور نثاروں کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کے کلام اور تصانیف پر مختصر تنقید کے کھینچا جائے۔

ب۔ ایک طبقے کے تعلقات دوسرے طبقے کے ساتھ اور ایک فرد کے تعلقات دوسرے فرد کے ساتھ اس میں وضاحت سے بیان کیے جائیں۔

ج۔ مختلف تحریکوں اور طرزوں کی ابتداء اور ترقی اور زوال کے اسباب بتائے جائیں اور اس دور کے تاریخی حالات و واقعات بھی نظر انداز نہ کیے جائیں، جن سے وہ شعراء اور نثار گزرے۔

۱۔ ایضاً، ص ۲۸-۲۹ (التماسِ مترجم)۔

د- یہ کتاب محض کسی زمانے کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں بلکہ، ان خیالات اور خصوصیات کے دکھانے کی اس میں پوری کوشش کی گئی ہے جن کا اثر اس زمانے پر تھا- [1]

ادبی تاریخ نویسی کے بارے میں سکسینہ کے یہ تصورات اس دور کے تاریخی مزاج کے لحاظ سے نہایت جدید اور واضح ہیں، یقیناً کسی اعلیٰ اور معیاری تاریخ کو محض سنین اور واقعات کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آسے اس دور کی سماجی اقدار، نسل، ماحول، تحریکات اور رجحانات کی لفظی تصویر بھی ہونا چاہیے- یہی نہیں بلکہ دور جدید میں تاریخ کی کتابوں سے یہ مطالبہ بھی کیا جانے لگا ہے کہ ان کے مصنفین ظاھری حالات و واقعات سے مطمئن نہ ہوں، بلکہ ان کے بطون تک پہنچنے کی کوشش کریں اور اس بات کا سراغ لگائیں کہ فن کاروں نے کن حالات میں اپنے تخلیقی عمل کو جاری رکھا، اور ان کی شخصیات اپنے اپنے ارتقا کی کون کون سی منزلوں سے گزریں، نیز انھوں نے اپنے ماحول سے کیا کچھ سیکھا اور اس کی کتنی جھلک ان کی تخلیقات میں موجود ہے، سکسینہ کی تاریخ اس مطالبے پر کلی طور پر تو نہیں لیکن جزوی طور پر پوری اترتی ہے-

اردو شعر و ادب کی تاریخ نے تذکروں کی فضا میں آنکھ کھولی، جن میں بیش تر فارسی، کچھ فارسی سے ترجمہ شدہ اور چند ایک اردو یا ان کے علاوہ کچھ تذکرہ نما تاریخیں ہیں، جو سب مل کر ایک "مربوط" اور "مکمل" ادبی تاریخ کی تصنیف میں مددگار تو ہوسکتے ہیں، مگر خود تاریخ نہیں کہلاسکتے-

---

۱- ایضاً، ص ۱۸ (تمہید از مصنف)-

ایسے میں سکسینہ نے ایک جامع ادبی تاریخ تصنیف کر کے ایک ایسے عملی سلسلے کا آغاز کیا جو ہنوز جاری ہے، یہی وجہ ہے کہ سکسینہ کی تاریخ جو اس زمانے کے تاریخی و علمی مزاج کے عین مطابق ہے، اس سلسلے کی اولین تصانیف میں شمار ہوتی ہے، جس میں پہلی مرتبہ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء اور اس کے مختلف ناموں سے متعلق معلومات کو یک جا کیا گیا، اور نظم و نثر دونوں کو مع شعراء اور نثرنگاروں کے حالاتِ زندگی اور انتخابِ کلام، ایک ساتھ مربوط انداز میں، اس زمانے کے تنقیدی اصولوں کے مطابق پیش کیا گیا۔

ہرچند کہ اسی زمانے میں اسالیب پر ڈاکٹر زور کی تصنیف "اردو کے اسالیبِ بیان" (۱۹۲۷ء) اور نثر کے سلسلے میں "اربابِ نثرِ اردو" (سید محمد، ۱۹۲۷ء) اور اس سے پہلے "سیرالمصنفین" (محمد یحییٰ تنہا، ۱۹۱۴ء) اور شاعری کی تاریخ کے سلسلے میں "گلِ رعنا" (مولوی عبدالحئی ۱۹۲۳ ء) "شعرالہند" (مولوی عبدالسلام ندوی، ء) اور اسی موضوع پر "تاریخ زبانِ اردو" یعنی "اردوئے قدیم" (حکیم شمس‌اللہ قادری، ۱۹۲۵ء) اور "اردو زبان کی تاریخ" (جوئل واعظ لال، ۱۹۲۰ء) میں اوّل اوّل اس موضوع پر قلم اٹھایا گیا، لیکن جس معیار کے تاریخی شعور اور جامعیت کا اہتمام سکسینہ نے اپنی تصنیف میں کیا وہ کسی سے نہ بن پڑا۔

یہاں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ ان سب تصانیف میں مولانا آزاد کی تصنیف "آبِ حیات" (۱۸۸۰ء) کو ہر لحاظ سے اوّلیت اور فوقیت حاصل ہے، کہ شعری تنقید اور انشاء پردازی کے علاوہ باقاعدہ ادبی تاریخ نویسی کا آغاز بھی اسی سے ہوا۔ اس

کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کچھ خصوصیات قدیم تذکرہ نویسی کی اور کچھ خصوصیات ادبی تاریخ کی ہیں، مثال کے طور پر تنقید کا تاثراتی انداز اور شعراء کے انتخابِ کلام کا طریقہ وہی ہے، جو ہمیں قدیم تذکروں میں ملتا ہے، لیکن اس لحاظ سے ادبی تاریخ کی جھلک بھی ملتی ہے کہ اسے (ادبی تاریخ کو) مختلف ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اور پھر ان کے سیاسی پس منظر اور ادبی رجحانات کی تفصیل اور حالات اور نظریات کی روشنی میں ہر دور کی شاعری کے فنی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جن کے پیشِ نظر "آبِ حیات" قدیم تذکرہ نویسی کی خصوصیات رکھتے ہوئے بھی ادبی تاریخ کے زمرے میں آجاتی ہے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ "آبِ حیات" بعد میں لکھی جانے والی تاریخوں کا سب سے بڑا ماخذ بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر تاریخ نویس کی طرح خود سکسینہ نے بھی اس وقت تک "جس قدر کتابیں اور رسالے اس مضمون پر تالیف ہوئے تقریباً سب . . . کا مطالعہ . . . بہت غور سے کیا"۱، اور دستیاب تذکروں، ادبی تاریخ کے دیگر ماخذوں اور اس سلسلے کے مضامین کے ساتھ ساتھ "آبِ حیات" سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔۲ اس کے علاوہ اس

۱۔ رسالہ سہ ماہی اردو، اورنگ آباد، دکن، بابت، جنوری ۱۹۲۸ء، ص ۱۳۸۔

۲۔ اس تالیف کے ماخذات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنے مقدمے میں رقم طراز ہیں کہ: "اس تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات'

(بقیہ صفحہ ۲۴۹ پر)

کتاب کو تاریخی اور انفرادی اعتبار سے مزید جامع بنانے کے لیے انگریزی زبان و ادب سے ان کی گہری واقفیت نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ھے کہ سکسینہ نے اس کتاب کو انگریزی میں تحریر کیا تھا اس طرح یہ کتاب صرف ایک طبقے یعنی "انگریزی دان طبقے کی ضروریات کو پورا کرتی تھی" اور اردو دان طبقہ اس کے فیض سے محروم تھا۔ اور مترجم عسکری کے خیال میں "ایسی کتاب کو عام ھونا چاہیے" تاکہ ھر شخص اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ لہذا اس کمی کو پورا کرنے کے لیے تقریباً دو ھی سال بعد یعنی ۱۹۲۹ء میں مرزا محمد عسکری نے اس کا اردو ترجمہ مع اضافۂ حواشی اور نمونہ کلام "تاریخ ادب اردو" کے نام سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا، جسے نول کشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا، اسی سلسلے میں گفتگو کرتے ھوئے مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، مولانا امتیاز علی خان عرشی کے حوالے سے رقم طراز ھیں کہ " عرشی صاحب

(بقیہ صفحہ ۲۴۸ کا میٹر)

ھے، اگرچہ مولف نے آزاد کے بعض افسانوی بیانات کی تردید کی ھے لیکن بعض اغلاط اور بعض افسانوی بیانات کو انھوں نے قبول بھی کرلیا ھے۔ لطف کا تذکرہ 'گلشنِ ھند' بھی مولف کے پیشِ نظر رھا ھے اور مولف نے مرزا علی لطف کو غیر معتبر راوی قرار دیا ھے۔ . . . مصحفی کے 'تذکرہ ھندی' کے حوالے بھی دیے گئے ھیں، لیکن شاید یہ تذکرہ مولف نے خود دیکھا نہیں"۔ (رام بابو سکسینہ: "تاریخ ادب اردو"، مقدمہ از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاھور، سنگ میل پبلی کیشنز، سن ندارد، ص ۷، ۸)۔

کے مطابق یہ ترجمہ "۱۹۲۹ء میں کہیں کہیں مناسب رد و بدل کے ساتھہ مرتب کیا گیا ھے۔ یہ کتاب دو حصوں اور ایک ضمیمے پر مشتمل ھے اور مطبع نول کشور لکھنؤ نے مصور شائع کی ھے۔" ۱

عسکری صاحب چوں کہ لیجسلیٹو ڈیپارٹمنٹ، کلکتہ میں ھیڈ ٹرانسلیٹر رہ چکے تھے اور اس سے پہلے درس و تدریس سے بھی وابستہ رھے تھے، اس لیے ترجمے کے فن اور اس کے اسرار و رموز کے ساتھ ساتھ اپنے موضوع کی دیگر ضروریات سے بھی پوری طرح واقف تھے باوجود اس کے کہ اس کتاب کے ترجمے کے سلسلے میں بعض ایسی مشکلات سے بھی دوچار ھوئے، جو خاص طور پر اسی ترجمے میں پیش آئیں چناں چہ لکھتے ھیں:

> "ترجمے کی مشکلات کے علاوہ بعض دوسری مشکلوں سے بھی دوچار ھونا پڑا۔ بعض باتیں ایسی تھیں کہ وہ اگرچہ اول اردو ھی میں تھیں، مگر قدیمی تذکرہ نویسوں نے اس کو فارسی میں بیان کیا، پھر انھیں کو اردو میں بیان کیا اور پھر اردو سے انگریزی میں بیان کی گئیں، اس لیے ان میں کچھ نہ کچھ تباین ھوگیا اس میں مصنف ایک حد تک معذور تھے لیکن ان کو اردو میں دوبارہ اسی حیثیت سے لانا مشکل تر تھا، جس کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی ھے۔ اور جہاں انھیں مضامین ماخوزہ کا اعادہ کرنا پڑا ھے تو ان کے الفاظ کو نیا جامہ پہنا دیا گیا ھے۔ بعض واقعات ایسے تھے

۱- رام بابو سکسینہ: "تاریخ ادب اردو"، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، لاھور، ولی منزل، سن ندارد، ص ۳۹۔

جنھیں اصل کتاب میں مجملاً بیان کیا گیا تھا۔ مگر اردو میں ان کی کسی قدر تفصیل ضروری تھی۔ ان کو بھی اس میں بیان کیا گیا۔ اور اس میں تحقیق و تنقیم کما ینبغی کی گئی . . . کہیں کہیں مترجم اور مصنف کی رائے میں اختلاف تھا جس کو فٹ نوٹ کے تحت میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔۱

ان تمام مشکلات کے ہوتے ہوئے عسکری صاحب نے اپنی تمام صلاحتیں بروئے کار لا کر اس قدر سلیس رواں اور موزوں ترجمہ پیش کیا، جس پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے اور بقول مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی:

”مرزا محمد عسکری نے غیر زبان میں لکھی ہوئی کتاب کو جب خود ھی اس زبان میں لکھا تو ایسی نکھری کہ اصل کے پڑھنے والے کم اور ترجمہ دیکھنے والے زیادہ ہوگئے اور اسی کو حوالے کے لیے استعمال کیا گیا. . . تاریخ ادب اردو لکھنوی دبستان کی سادہ نگاری کا کامیاب نمونہ ہے۔“۲

عسکری کا ترجمہ، زبان اور اسلوبِ نگارش کی خوبیوں کے علاوہ اس لحاظ سے بھی بے حد اہم ہے کہ اس میں کتاب کے بنیادی خاکے کو برقرار رکھتے ہوئے جزوی تبدیلیوں کے ذریعے ان خامیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں سے بعض کا تعلق براہ راست مصنف سے ہے، بہ جز ان کے جن کی طرف خود مصنف نے اپنی تمہید میں اشارہ کر کے بعض کا جواز اور بعض کی آئندہ تلافی کا وعدہ کیا ہے، مثلاً:

۱۔ رام بابو سکسینہ: ”تاریخ ادب اردو“، مترجمہ مرزا محمد عسکری، لکھنؤ، نول کشور پریس، سن ندارد، ص ۲۹، ۳۰۔

۲۔ رام بابو سکسینہ: ”تاریخ ادب اردو“، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، لاھور، ولی سنز، سن ندارد، ص ۱۳، ۱۴۔

۱- ماخذات کے حوالے نہیں دیے گئے۔
۲- مصنفین اور شعراء کے کلام سے اقتباسات پیش نہیں کیے گئے۔
۳- کتاب میں موجودہ دور کے شعراء کا ذکر نہیں کیا گیا۔

جہاں سکسینہ نے فراخ دلی کے ساتھ ان خامیوں کا اعتراف کیا ہے، وہیں ان کی تلافی کا وعدہ بھی کیا ہے کہ آئندہ ایک کتاب بطور ضمیمے کے مرتب کی جائے گی، جس میں ہر دور کے خاص خاص مصنفین کی کتابوں سے اقتباسات مع انگریزی ترجمے کے دیے جائیں گے۔ اسی طرح ماخذات کے لیے علیحدہ رسالہ "ماخذ ادبِ اردو" کے نام سے شائع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ موجودہ دور کے شعراء سے متعلق تو وہ ایک کتاب ترتیب دے ہی رہے تھے۔

ہر چند کہ مذکورہ وعدے سب کے سب پورے نہیں ہوئے۔ لیکن اس سے کتاب کی قدر و منزلت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ سکسینہ نے جس مقصد کے پیش نظر یہ کتاب تحریر کی وہ مذکورہ خامیوں کے باوجود بھی نہایت عمدگی سے پورا ہوجاتا ہے۔ اور پھر اس صورت میں کہ بعض خامیاں عسکری صاحب نے اپنے ترجمے میں پوری بھی کردیں اور تصاویر، ضمیمے اور انڈیکس نے کتاب کی دل چسپی اور افادیت میں مزید اضافہ کردیا۔

ترجمہ شدہ نسخہ بھی اصل کتاب کی طرح کل ۱۹ ابواب پر مشتمل ہے، جس میں ۱۴ ابواب حصۂ نظم کے لیے مخصوص ہیں اور ۵ ابواب حصہ نثر کے لیے، ہر باب میں ذیلی عنوانات کا اہتمام بھی کیا گیا ہے، اور ہر شخصیت کو اس کی حیثیت اور مرتبے کے مطابق صفحات دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں کتاب سے متعلق موقر اور معزز اصحاب کی قیمتی آراء بھی دی گئی

ھیں، جن کے مطالعے سے اس دور میں کتاب کی اھمیت کا اندازہ ھوتا ھے۔ اھل علم حضرات کے علاوہ اس زمانے کے تقریباً تمام علمی و ادبی جرائد نے بھی اس کتاب پر تبصرہ کیا مثلاً رسالہ معارف، اعظم گڑھ کی رائے ملاحظہ ھو:

"اس کتاب میں جیسا مرزا محمد عسکری نے بالکل سچ لکھا ھے، زبان اردو کی پیدایش، ھندی بھاشا اور دوسری زبانوں سے اس کا ارتباط نثر و نظم کے ادوار مختلفہ، ان کے مشہور و معروف افراد، ان پر تنقیدیں موجودہ اساتذہ کے حالات، تمام اصنافِ نظم پر روشنی، ان کی ابتدا و انتہا کے تاریخی نقطہ نظر سے انکشافات، نثر اردو کے مصنفین، اس کی عہد بہ عہد کی ترقیاں، ان کی تصانیف پر نقد و تبصرہ، مشہور نثاروں کا اردو نثر کے اصناف وغیرہ پر بسیط رائیں، غرض یہ کہ سب ھی کچھ اس میں موجود ھے، البتہ چوں کہ تمام مباحث کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ھے، اس لیے یہ کہنا بھی صحیح ھے کہ کتاب میں سب کچھ ھے لیکن مکمل طور پر نہیں ھے، اگرچہ مترجم نے حواشی و تعلیقات سے یہ کمی بڑی حد تک پوری کردی ھے۔" ۱

یہی وجہ ھے کہ ایک عام قاری جو ایک بار اس کا مطالعہ شروع کردے تو کتاب کی دل چسپیاں اسے اختتام تک پڑھنے پر مجبور کردیتی ھیں، اور اس کے بعد وہ اردو زبان و ادب کے بارے

۱۔ رسالہ معارف، اعظم گڑھ، جلد ۲۷، اپریل سنہ ۱۹۳۱ء، ص ۳۱۳۔

میں ایک مربوط تصور قائم کرلیتا ھے، لیکن بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار:

"ایک ایسے طالب علم کے لیے جسے اردو ادبیات کے گوناگوں مسائل کا جائزہ لینا ھوتا ھے، یہ تاریخ کچھ الجھنیں بھی پیدا کردیتی ھے، جن سے بچ کر نکلنا اور صحیح نتیجے پر پہنچنا اس کے لیے ضروری ھوجاتا ھے۔ ان میں سے بعض الجھنیں تو نظریاتی اختلافات سے پیدا ھوتی ھیں اور بعض بیانات کے تضاد سے اور بعض تحقیقی اغلاط سے۔" ۱

(۱)

اسی نوعیت کی بعض اغلاط کی نشاندھی بزرگ محقق، ڈاکٹر مختارالدین احمد، آرزو نے اپنے ایک پر از معلومات، تحقیقی و تنقیدی مقالے "تاریخ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ" مشمولہ ادبی دنیا، لاھور، بابت دسمبر ۱۹۴۰ء میں کی ھے۔ اس طویل مقالے کے پہلے حصے میں ڈاکٹر آرزو نے ان اغلاط سے بحث کی ھے، جو کتاب پر سرسری نظرڈالنے سے ھی کھٹکنے لگتی ھیں، مثلاً:

۱— مولف سید عبدالولی عزلت کو دکنی شاعر سمجھتے ھیں، جوکہ غلط ھے۔

۲— محمد قلی قطب شاہ بہ قول سکسینہ فارسی میں "قطب شاہ" اور اردو میں "معانی" تخلص کرتے تھے۔ جب کہ ان کے اردو کلام میں بھی تخلص "قطب شاہ" موجود ھے۔

۳— سکسینہ نے "جل ترنگ" اور "گل باس" کے مصنف کا نام شاہ

۱۔ رام بابو سکسینہ: "تاریخ ادب اردو"، مقدمہ از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاھور، سنگ میل پبلیکیشنز، سن ندارد، ص ۷۔

برهان الدین جانم لکھا ہے، جب کہ ان کا صحیح نام شاہ برهان الدین عالم ہے۔

۴۔ عین الدین گنج کو سکسینہ نے اردو مصنفین میں شمار کیا ہے، جب کہ اب تک ان کی کوئی بھی اردو تصنیف منظر عام پر نہیں آئی۔

۵۔ شاہ میراں جی حسن خدانما کے رسالے کا نام "شرح مرغوب القلوب" بتایا گیا ہے، جب کہ ان کے رسالے کا نام "شرح تمہید همدانی" ہے۔

۶۔ امین مصنف "یوسف زلیخا" کو سکسینہ نے دکنی قرار دیا ہے، جب کہ ان کا شمار گجراتی زبان کے حوالے سے ہونا چاہئیے۔

۷۔ شاہ نصیر کو سکسینہ نے سودا کا شاگرد قرار دیا ہے، جو کہ غلط ہے۔

۸۔ "تحفتہ النصائح" کا سال تصنیف سکسینہ نے ۱۰۳۶ھ لکھا ہے جب کہ صحیح ۱۰۳۵ھ ہے۔

۹۔ سکسینہ کے بیان کے مطابق "شتاب رائے، خود بڑا شاعر اور ادب نواز تھا، وہ خود بھی شاعر یکتا تھا"۔ یہ بات بھی غلط ہے۔

۱۰۔ حزیں کے ضمن میں صولت جنگ کا ذکر پٹنہ کے نواب اور رئیس کی حیثیت سے کرنا بھی غلط ہے۔

ان کے بعد ڈاکٹر آرزو نے اپنے اس مضمون میں آگے چل کر تقریباً (۱۰۰) سو مزید اغلاط کی نشان دھی کی ہے، جن کے مطالعے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی نظر کی گہرائی اور تنقیدی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے، اس مضمون کی بُنت میں ڈاکٹر صاحب نے جو انداز اختیار کیا ہے، اس کی ایک ہلکی سی جھلک مولوی عبدالحق

کے اس مضمون میں دیکھی جا سکتی ہے جو انھوں نے ڈاکٹر گریہم بیلی کی تصنیف "اردو لٹریچر" پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنایا ہے۔ اور جس کا اہتمام قاضی عبدالودود اپنی تحریروں میں کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر آرزو نے اپنے اس مضمون میں ایک ناقد اور محقق کے ساتھ، ساتھ مصحح کا کام بھی کیا ہے، یعنی صرف اغلاط کی نشان دھی پر ھی اکتفا نہیں کیا، بلکہ انھیں حل بھی کیا ہے۔ لیکن یہاں اختصار کامل سے کام لیتے ہوئے صرف چند نکات کا خلاصہ پیش خدمت ہے، جو ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں، مثال کے طور پر "چوتھے باب" (قدیم شعرائے دکن) میں ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" کا سن تصنیف مولف نے ۱۰۷۶ھ بتایا گیا ہے۔ (تاریخ ادب اردو، نولکشور ایڈیشن ص ۹۶) جب کہ اس کا صحیح سنِ تصنیف بہ قول ڈاکٹر آرزو ۱۰۶۶ھ ہے۔ اسی صفحے پر سکسینہ نے غواصی کا مذھب "شیعہ" بتایا ہے، جب کہ ڈاکٹر صاحب نے داخلی شہادتوں کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ وہ مذھباً "سنی" تھے۔ اگلے صفحے پر مولف نے وجہی کی تصنیف "سب رس" کے دو سنِ تصنیف بیان کیے ہیں، جب کہ خود وجہی نے "سب رس" کے خاتمے پر ۱۰۴۵ھ لکھ کر ہر قسم کے ابہام کو ختم کردیا تھا۔

آگے صفحہ ۴۷، پر مولف رقم طراز ہیں کہ "ظہوری کی دو کتابیں 'خوانِ خلیل' اور 'گل زارِ ابراھیم' ہیں، جب کہ "گل زارِ ابراھیم" نواب ابراھیم علی خان کے تذکرے کا نام ہے اور ظہوری کی کتاب کا صحیح نام "گل زارِ ابراھیمی" ہے۔۱ اس سے آگے صفحہ

۱۔ خود سکسینہ نے بھی حصۂ نثر، صفحہ ۱۰۹ پر "گل زارِ ابراھیم" کا ذکر نواب علی ابراھیم خاں کے تذکرے کی حیثیت سے کیا ہے۔ سلیم

۵۷، پر "نورس" کے بارے میں لکھا ھے کہ یہ کتاب "نظم دکھنی" میں ھے، جب کہ یہ کتاب "زبانِ ھندی" میں ھے، اور اس سے آگے "خاور نامہ" کے مترجم کے بارے میں لکھتے ھیں کہ "رسمی کا نام کمال خاں ولد اسماعیل خاں ..." (ایضاً، ص ۷۶) جب کہ کمال خاں کا تخلص "رسمی" نہیں بلکہ "رستمی" ھے۔ اسی صفحے پر نصرتی کے بارے میں سکسینہ کا بیان ھے کہ "اس نے محمد عادل شاہ کے زمانے میں دربار میں رسائی حاصل کی اور علی عادل شاہ کے دور میں عروج پایا اور ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا"۔ (ایضاً، صفحہ ۷۶) جب کہ فتوت ریاض حسنی میں لکھتا ھے کہ عالم گیر نے فتح دکن کے بعد تمام شعراء کو بلایا، نصرتی بھی آئے، کلام سنایا اور ملک الشعرائے ھند کا خطاب پایا۔ آگے چل کر اسی ضمن میں مولف مزید رقم طراز ھیں کہ "نصرتی حاکمِ کرناٹک کے قرابت داروں میں سے تھا"۔ (ایضاً، ص ۷۷) بہ قول ڈاکٹر صاحب اس کا کوئی معتبر ثبوت نہیں ملتا، اس کا نام "نصرت" ھونا بھی متحقق نہیں ھے۔ اسی صفحے پر مولف مزید رقم طراز ھیں "نصرتی کرناٹک سے سیر کرتا ھوا بیجاپور آیا" اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا کہنا ھے کہ "مولف نے یہ بیان 'تذکرۂ شعرائے دکن' سے لیا ھے، ان کا بیان یہ ھے کہ 'نصرتی مدت تک کرناٹک میں رھا پھر سیر کرتا ھوا بیجاپور آیا"۔ اسی صفحے پر نصرتی کا سال وفات مولف نے ۱۰۹۵ھ لکھا ھے، جو صحیح معلوم نہیں ھوتا، کہ صحیح مان لینے کی صورت میں فتوت کا بیان غلط ماننا پڑے گا اس لیے کہ یہ متحقق ھے کہ عالم گیر نے بیجاپور ۱۰۹۷ھ میں فتح کیا تھا۔

اسی باب میں سکسینہ نے عاقل خاں رازی کی مثنوی کا نام

" شمع و پروانہ " لکھا ہے (ایضاً، ص ۷۷-۷۸) جب کہ اس کا صحیح نام " مہر و ماہ" اور سالِ تصنیف ۱۰۶۵ھ ہے، نیز اس کے دوسرے نام "قصہ عشق" اور " نجم نامہ " بھی ہیں۔ آگے چل کر ہاشمی کے دیوان کے بارے میں مولف رقم طراز ہیں کہ " یہ مجموعہ اس وقت نایاب ہے"(ایضاً، ص ۹۷) جب کہ ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ ہے کہ یہ مجموعہ نایاب نہیں ہے اور ہندوستان میں بھی بعض جگہ دستیاب ہے مثلاً ایک نسخہ جناب آغا حیدر حسن اور ایک نسخہ ایڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اسی صفحے پر شاہ ملک کے بارے میں مولف لکھتے ہیں کہ " شاہ ملک بیجاپور کے باشندے تھے " (ایضاً، ص ۹۷) بہ قول ڈاکٹر صاحب " ان کے بیجاپوری ہونے کا کوئی معتبر ثبوت نہیں ملتا " اور علی عادل شاہ کے معاصر ہونے والی بات بھی درست نہیں۔

شاہ امین کے بارے میں مولف رقم‌طراز ہیں کہ "۱۰۸۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا " (ایضاً، ص ۹۷) جب کہ شاہ امین کی صحیح تاریخ وفات ۱۰۸۶ھ ہے۔ صفحہ ۸۰، پر سکسینہ نے امین کی صرف تین تصانیف کا ذکر کیا ہے جب کہ اب تک ان کی دس تصانیف کا پتہ مل چکا ہے۔ اسی، صفحے پر مصنف (صحیح مترجم) "قصہ فیروز شاہ و ملکہ مصر" کا نام محمد علی اور تخلص "عاجز" لکھا گیا ہے، جب کہ ان کا تخلص "محمود" تھا اور وہ ایک صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کی مثنوی کا نام " لال و گوہر " بھی مولف نے غلط لکھا ہے ، اس کا صحیح نام "لعل و گوہر" ہے۔

صفحہ ۸۱، پر ولی ویلوری کا نام مولف نے سید محمد فیاض لکھا ہے، جب کہ ان کا صحیح نام میر ولی فیاض ہے اسی صفحے پر بحری

سکندری کے بارے میں لکھا ہے کہ بحری "سکندر عادل شاہ کے دربار میں دو سال رہے اور جب ۱۰۱۷ھ میں سلطنت تباہ ہوگئی تو حیدرآباد چلے آئے"۔ (ایضاً، ص ۸۱) جب کہ ڈاکٹر آرزو کے مطابق سلطنت ۱۰۱۷ھ میں نہیں بلکہ ۱۰۹۷ھ میں تباہ ہوئی تھی۔ اسی صفحے پر مولف نے ان کی مثنوی "من لگن" کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی زبان "مشکل اور الفاظ سخت ہیں" جب کہ ڈاکٹر صاحب نے ثابت کیا ہے کہ اس کی زبان بہت گوارا اور دوسری دکنی مثنویوں کے مقابلے میں زیادہ صاف ہے۔

"من لگن" کا سن تصنیف سکسینہ نے ۱۱۱۲ھ لکھا ہے جو کہ صحیح نہیں اس کا صحیح سال تصنیف ۱۱۱۱ھ ہے اور یہ ۱۸۲۹ء میں بنگلور سے شائع بھی ہو چکی ہے۔ اسی صفحے پر ولی دکنی کی "روضۃ الشہداء" کے بارے میں مولف رقم‌طراز ہیں کہ "یہ ۱۱۱۹ھ میں لکھی گئی تھی" (ایضاً، ص ۸۱) جب کہ ڈاکٹر صاحب نے ثابت کیا ہے کہ "اس کا صحیح سن تصنیف ۱۱۳۰ھ ہے۔ آگے چل کر اسی سلسلے میں سکسینہ مزید رقم طراز ہیں کہ "وجدی تخلص کے دکن میں دو شاعر گذرے ہیں، ایک جس نے 'تحفۂ عاشقاں' لکھی دوسرا جس نے 'پنچھی باچا" (ایضاً، ص ۸۲)۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ مصنف "تحفۂ عاشقاں" نے ہی "پنچھی باچا" لکھی اور اس کا صحیح سن تصنیف ۱۱۳۱ھ ہے، اسی صفحے پر سکسینہ نے "تحفۂ عاشقاں" کا سال تصنیف ایک جگہ ۱۰۰۵ھ، دوسری جگہ ۵۰۵۳ھ اور تیسری جگہ ۱۰۵۵ھ لکھا ہے، ظاہر ہے بہ یک وقت تینوں صحیح نہیں ہو سکتے۔

اسی باب میں ولی کے اسفار شمالی ہند سے متعلق مولف رقم طراز ہیں کہ :

"تذکروں میں ہے کہ ولی دو مرتبہ دلی آئے، ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد یعنی ۱۷۰۰ء میں . . . دوسری مرتبہ سید ابوالمعالی کے ساتھ سفر کیا، جس میں دلی اور سرہند کے مزارات کی زیارت کی . . . ولی کا یہ دوسرا سفر محمد شاہ کے عہد سلطنت ۱۱۳۴ھ مطابق ۱۷۲۲ء میں ہوا، اس سفر میں ولی اپنا دیوان ریختہ بھی ساتھ لائے۔" (ایضاً، ص ۸۵)

اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ "کسی قدیم و مستند تذکرے سے ولی کا دو بار دلی آنا ثابت نہیں" ہوتا، اس سلسلے میں وہ "مخزن نکات" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ولی ۴۴ سن جلوس عالمگیر یعنی ۱۱۱۲ھ میں دلی آئے تھے اور دوسری بار صرف ان کا دیوان ریختہ دلی آیا تھا۔ اس باب میں سکسینہ مزید رقم طراز ہیں کہ:

"شاہ سعداللہ گلشن نے کہا یہ سب مضامین بے کار فارسی میں پڑے ہیں ان کو زبانِ ریختہ میں لاؤ، تم سے کون محاسبہ کرے گا"۔ (ایضاً ص ۸۵)

بہ قول ڈاکٹر صاحب کئی تذکروں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے لیکن پھر بھی یہ بات موجودہ تحقیق کی روشنی میں درست معلوم نہیں ہوتی، اصل بات یہ ہے کہ ولی ۱۱۰۹ھ سے قبل ہی ریختہ میں طبع آزمائی کرتے تھے، گلشن سے ان کی ملاقات بعد میں ہوئی۔ اگلے صفحے پر مولف نے "دہ مجلس" کو بھی ولی کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔ ڈاکٹر آرزو کے مطابق یہ بھی غلط ہے، کیوں کہ ولی نے اس نام کی کوئی مثنوی نہیں لکھی۔ یہ اصل میں ولی دیلوری کی تصنیف

ہے اور اس کا سال تصنیف ۱۱۰۱ھ ہے۔" ویسے بھی ۱۱۱۹ھ ولی کا سن وفات متعین ہوجانے کے بعد ۱۱۴۱ھ میں ولی کی دلی سے اورنگ آباد واپسی خارج از بحث ہے۔"۱ اسی صفحے پر ولی کے سال وفات کے متعلق مولف لکھتے ہیں: "بہ قول 'تذکرۂ شعرائے دکن' ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۴ء انتقال کیا"۔ (ایضاً، ص ۸۶) جب کہ ڈاکٹر صاحب مولوی عبدالحق کے حوالے سے ۱۱۱۹ھ بتاتے ہیں۔ ولی کے سال وفات کے سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تصنیف " تاریخ ادب اردو" میں ایک سیر حاصل تجزیاتی بحث کے بعد داخلی اور خارجی شواہد کی مدد سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

> "ولی کا سال وفات ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء کے بجائے ۱۱۳۲ھ / ۱۷۲۰ء کے بعد اور ۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۵ء سے پہلے متعین ہوتا ہے۔"۲

اسی باب میں آگے چل کر سراج کے ذکر میں مولف لکھتے ہیں کہ "میر نے 'نکات الشعراء' میں اور حسن نے اپنے تذکرے میں تحریر کیا ہے کہ سراج کو سید حمزہ دکنی سے تلمذ تھا"۔ (ایضاً، ص ۹۰)۔ بہ قول ڈاکٹر آرزو یہ بات شمالی ہند کے بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی لکھی ہے، لیکن "سراج کے معاصر اور هم وطن تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔"

۱۔ رام بابو سکسینہ: " تاریخ ادب اردو"، مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاهور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۱۰ (مقدمۂ مرتب)۔
۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخ ادب اردو"، جلد اول، طبع دوم، لاهور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء، ص ۵۳۸۔

اس لیے سکسینہ کا یہ بیان درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد "پانچویں باب" (اساتذۂ دہلی، حصہ اول، طبقۂ متقدمین) میں شاہ مبارک آبرو کے ذکر میں مولف رقم طراز ہیں کہ ان کا دیوان "زمانۂ غدر میں تلف ہوگیا، اب نایاب ہے"۔ (ایضاً، ص ۹۹) اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ "یہ دیوان نایاب نہیں ہے، اس کے چار پانچ نسخے اب بھی پائے جاتے ہیں۔" اس کے بعد آبرو کے سالِ وفات سے متعلق مولف لکھتے ہیں کہ آبرو نے "۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۵۰ء میں پچاس برس کی عمر سے متجاوز ہوکر وفات پائی" (ایضاً، ص ۱۰۰) بقول ڈاکٹر صاحب اس مختصر سے جملے میں سکسینہ نے تین غلطیاں کی ہیں۔

(الف) ۱۱۶۱ھ اور ۱۷۵۰ء میں مطابقت نہیں ہے۔

(ب) آبرو کی تاریخ ولادت کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھی اور خود سکسینہ بھی صفحہ ۹۹، پر یہ اعتراف کرچکے ہیں کہ "پیدایش کی تاریخ معلوم نہیں۔" اور جب پیدایش کی تاریخ معلوم نہیں تو مولف نے پچاس برس کی عمر کا تعین کس طرح کیا۔

(ج) سکسینہ نے آبرو کا سالِ وفات ۱۱۶۱ھ لکھا ہے جو کہ غلط ہے، صحیح ڈاکٹر صاحب نے خوش گو کے حوالے سے ۱۱۴۶ھ لکھا ہے۔

سکسینہ نے خان آرزو کا سالِ ولادت ۱۶۸۹ء لکھا ہے جس کی مطابقت ۱۱۰۲ھ سے ہے، جو کہ غلط ہے۔ صحیح سال ولادت ۱۰۹۹ھ ہے۔ صفحہ ۱۰۶، پر سکسینہ نے خان آرزو کی تصانیف کی تعداد پندرہ لکھی ہے، جب کہ ڈاکٹر آرزو کے مطابق اب تک خان آرزو کی بیس تصانیف کا سراغ مل چکا ہے، مزید یہ

کہ انھوں نے "غرائب اللغات" کو بھی خان آرزو کی تصانیف میں شمار کیا ہے۔ جب کہ یہ کتاب عبدالوسع ہانسوی کی تصنیف ہے۔

شاہ حاتم کے سالِ وفات کے بارے میں سکسینہ نے لکھا ہے "۱۷۹۱ء یا ۱۷۹۲ء میں انتقال کیا"۔ (ایضاً، ص ۱۰۴)۔ اس موقعے پر مترجم نے حاشیے میں اضافہ کیا ہے کہ "مصنف خم خانۂ جاوید کی تحقیق کے موافق ۹۶ برس کی عمر میں ۱۲۰۷ھ میں انتقال کیا"۔ (ایضاً، ص ۱۰۴) جب کہ یہ تحقیق مصنف "خم خانۂ جاوید" لالہ سری رام کی نہیں بلکہ مولانا آزاد کی ہے، سکسینہ اگر آبِ حیات کا صفحہ ۱۱۹ دیکھ لیتے تو یہ غلطی ہر گز نہ کرتے۔ اسی صفحے پر مولف مزید لکھتے ہیں کہ "مصحفی کا قول ہے کہ حاتم ۸۳ برس کی عمر میں ۱۱۹۶ھ میں فوت ہوئے"۔ (ایضاً، ص ۱۰۴) بقول ڈاکٹر صاحب فاضل مولف نے مصحفی کے اصل تذکرے نہیں دیکھے صرف "آبِ حیات" دیکھ لی ہے، کیوں کہ "مصحفی کا اصل بیان ہے کہ 'ہشتاد وسہ سال عمر دارد و دریک ہزار و یک صد و نو دو ہفت در ماہِ رمضان رحلت کرد' (عقدِ ثریا، ص ۲۴-۲۳) اس کے بعد سکسینہ نے حاتم کے سالِ وفات کے سلسلے میں کسی ایک سن کا تعین نہیں کیا بلکہ چار اقوال نقل کر دیے ہیں (۱) ۱۷۹۱ء (۲) ۱۷۹۲ء (۳) ۱۲۰۷ھ (۴) ۱۱۹۴ھ، اس کی وجہ یہ ہے کہ حاتم کے سالِ وفات میں اختلاف ہے۔ مختلف تذکرہ نویسوں نے مختلف سن لکھا ہے، اس مشکل کو ڈاکٹر صاحب نے ایک طویل اور مدلل بحث کے بعد حل کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ حاتم کا صحیح سالِ وفات ۱۱۹۷ھ ہے جو مصحفی کے تذکرے اور قطعے سے ثابت ہوتا ہے۔

مرزا مظہر جانِ جاناں کے باب میں واقعۂ قتل کا ذکر کرتے ہوئے مولف رقم طراز ہیں کہ "یہ واقعہ ۱۱۹۴ھ ۱۷۸۰ء کا ہے"۔ (ایضاً، ص ۱۰۸) جب کہ ڈاکٹر صاحب نے کئی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ "آپ کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔" آگے چل کر سکسینہ نے تاباں کے بارے میں اکثر تذکرہ نویسوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ "جوانی میں مرے" (ایضاً، ص ۱۰۹) بقول ڈاکٹر صاحب یہ صحیح نہیں کیوں کہ "موت کے وقت ان (تاباں) کی عمر ۳۵ سال سے کسی طرح کم نہ تھی یہ اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جب یہ مان لیا جائے کہ تذکرہ نویسوں کے ہاں ۳۵ برس کا آدمی جوان ہوتا ہے۔" اس کے بعد سکسینہ نے صاحب "گلشن ہند" کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ "انہوں[۱] نے ان کو ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ میں دیکھا تھا" (ایضاً، ص ۱۱۰) آگے چل کر فیلن کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ "۱۷۹۷ء یعنی ۱۲۱۱ھ تک وہ زندہ تھے" (ایضاً، ص ۱۱۰) ہر چند یہاں سکسینہ نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی، لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ ان بیانات کو صحیح سمجھتے ہیں، حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ تاباں سالِ تصنیفِ "نکات الشعراء" (۱۱۶۵ھ) سے قبل وفات پا چکے تھے۔

۱۔ لطف نے ۱۲۰۱ھ میں جس شخص کو دیکھا تھا، انہوں نے اس کا نام شاہ سلیمان بتایا ہے اور کہا ہے کہ تاباں اپنے زمانے میں ایک سلیمان نام کے لڑکے کو چاہتے تھے اور وہی سلیمان بالفعل شاہ سلیمان کر کے مشہور تھا، سکسینہ نے لطف کا یہ بیان غور سے نہیں پڑھا، ورنہ اس عام مغالطے کا شکار ہر گز نہ ہوتے۔

(رام بابو سکسینہ: "تاریخ ادب اردو"، مقدمہ از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، سن ندرد ص ۱-۱۲)۔

"چھٹے باب" (اساتذۂ دھلی، حصہ دوم، طبقۂ متوسطین) صفحہ ۱۲۳، بہ قول ڈاکٹر صاحب "مولف بھی اور لوگوں کی طرح اس غلط فہمی میں مبتلا ھیں کہ 'تذکرۂ ھندی' ایک ھی سال یعنی ۱۲۰۹ھ میں لکھا گیا۔ یہ صحیح نہیں مصحفی نے 'تذکرۂ ھندی' کی ابتدا بہ قول خود، تذکرۂ فارسی 'عقد ثریا' کے بعد کی"۔ "عقد ثریا" ۱۱۹۹ھ میں مکمل ھوئی۔ ثابت ھوا کہ سال آغاز "تذکرۂ ھندی" ۱۱۹۹ھ یا اس کے کچھ بعد ھے۔ اس لیے کہ مصحفی نے جہاں دار شاہ اور میر حسن دونوں کو بہ قیدِ حیات لکھا ھے اور دونوں نے ۱۲۰۱ھ میں وفات پائی۔

مولف "آبِ حیات" کے حوالے سے خواجہ میر درد کے سنِ وفات سے متعلق لکھتے ھیں "۱۱۹۹ھ میں بہ مقام دھلی چھیاسٹھ برس کی عمر میں انتقال کیا" (ایضاً، ص ۱۲۳) جب کہ مولانا آزاد نے "آبِ حیات" میں جو عبارت لکھی ھے وہ یوں ھے "خواجہ صاحب ۲۴ صفر یوم جمعہ ۱۱۹۹ھ '۶۸' برس کی عمر میں شہر دھلی میں فوت ھوئے"۔۱ آگے چل کر میر سوز کے ذکر میں سکسینہ لکھتے ھیں:

> "شاہ عالم کے زمانے میں جب دلی پر تباھی آئی اور لوگ بےحال تھے تو یہ دولت فقر سے مالا مال صوفیٔ باکمال تھے۔ وطن کی تباھی و بربادی سے افسردہ خاطر ھوکر نکل کھڑے ھوئے"۔ (ایضاً، ص ۱۲۴)۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا کہنا ھے کہ میر سوز اس سے

۱۔ محمد حسین آزاد: "آبِ حیات"، طبع شانزدھم، لاھور، شیخ مبارک علی، ۱۹۵۴ء، ص ۱۸۸۔

بہت پہلے یعنی ۱۷۷۵ء کے لگ بھگ دھلی سے روانہ ہوئے ہوں گے ، اسی باب میں آگے چل کر سودا کی تاریخ ولادت کے بارے میں مولف رقم طراز ہیں :

" آزاد تذکرہ ' آب حیات ' میں تاریخ ولادت ۱۱۲۵ھ لکھتے ہیں ، مگر یقین کے ساتھ اس کی صحت کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا ، اس وجہ سے کہ نہ تو معاصرین نے لکھا ھے اور نہ بعد کے تذکروں میں مرزا صاحب کی عمر یا سن ولادت کی تصریح ھے "۔ (ایضاً ، ص ۱۲۷) -

اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب قیام الدین قائم صاحب تذکرہ " مخزنِ نکات " اور میر حسن کے حوالے سے فرماتے ھیں کہ اس اعتبار سے سال ولادت ۱۱۱۵ھ اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان پڑتا ھے۔ سکسینہ اسی باب میں آگے چل کر رقم طراز ھیں کہ " سودا نے خان آرزو کی ھدایت کے موافق فارسی کو ترک کیا اور ریختہ کہنا شروع کیا "۔ (ایضاً ، ص ۱۲۸) جب کہ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی تحقیق یہ ھے کہ یہ مشورہ انہیں (سودا کو) ایک فارسی داں نے دیا تھا، اس میں آرزو کے مشورے کا کوئی دخل نہیں۔ اسی باب میں مولف مزید لکھتے ھیں :

" ان کی استادی کا چرچا اس قدر پھیلا کہ بادشاہ وقت شاہ عالم کو بھی ان کی شاگردی کا شوق ہوا . . . آخر کار مرزا کے شاگرد ہوئے اور اپنا کلام اصلاح کے لیے دکھانے لگے " (ایضاً ، ص ۱۲۸) -

سکسینہ کے اس بیان کا ماخذ " آب حیات " ھے ھر چند کہ یہاں انھوں نے آزاد کا بیان کردہ افسانہ نہیں دھرایا لیکن اس کی

طرف اشارہ ضرور کیا ہے۔ ڈاکٹر آرزو کے مطابق واقعہ یہ ہے کہ آفتاب کی شاگردی افسانے سے زائد وقعت نہیں رکھتی۔ اسی باب میں مولف مزید لکھتے ہیں "نواب شجاع الدولہ نے میرزا کو بلاوے کا خط بھیجا اور زادِ راہ بھی بھیجا، میرزا نے ٹال دیا اور کمال استغنا سے . . . رباعی جواب میں لکھ بھیجی" (ایضاً، ص ۱۲۸)۔ اس سلسلے میں آزاد کا بھی یہی خیال ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ ہاں یہ بخوبی ممکن ہے کہ شجاع الدولہ نے سودا کو اپنے قیام فرخ آباد کے زمانے میں بلایا ہو . . . اور سودا نے حسنِ معذرت کے طور پر رباعی لکھ بھیجی ہو۔ شجاع الدولہ کے علاوہ محمد یار خاں نے بھی انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی، لیکن وہ فرخ آباد میں اس قدر خوش تھے کہ اس کو بھی رد کردیا۔ اسی باب میں مولف مزید لکھتے ہیں کہ "مرزا اس قافلے کے ساتھ دلی سے نکلے، اس وقت ان کی عمر تقریباً ساٹھ برس تھی" (ایضاً، ص ۱۲۹) بہ قول ڈاکٹر صاحب مولف کا یہ خیال صحیح نہیں کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق سودا ۱۱۸۰ھ میں فرخ آباد گئے حالاں کہ صحیح یہ ہے کہ وہ ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ فرخ آباد پہنچے۔ اس کے بعد سکسینہ لکھتے ہیں "۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں مرگئے تو سودا بھی فیض آباد چلے گئے"۔ (ایضاً، ص۱۲۹) اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ مولف کا یہ بیان بھی صحت سے دور ہے، انھوں نے بعض شہادتوں کی مدد سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سودا نواب احمد خاں کی وفات سے قبل فرخ آباد کو خیرباد کہہ چکے تھے، ایسی صورت میں ان کے فیض آباد پہنچنے کی تاریخ ۱۱۸۳ھ اور ۱۱۸۵ھ کے درمیان پڑتی ہے۔ اسی باب میں مولف مزید رقم طراز ہیں کہ

"آصف الدولہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو ... سودا کو خطاب ملک الشعرائی اور چھے ہزار سالانہ کا وظیفہ عطا ہوا" (ایضاً، ص ۱۲۹، ۱۳۰) کسی معتبر تذکرے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، اور نہ خود سودا نے کہیں اپنے کلام میں اس کا تذکرہ کیا، صحیح یہ ہے کہ سودا کو یہ خطاب بہت پہلے مل چکا تھا، اس کی شہادت میر اور قائم کے بیانات سے بھی ملتی ہے کہ سودا آصف الدولہ کی تخت نشینی سے کم از کم ۲۳ سال قبل اس خطاب سے سرفراز ہوچکے تھے۔ اسی صفحے ۱۳۰، پر سودا کی تصانیف کے ذیل میں سکسینہ نے لکھا ہے کہ "چوبیس مثنویاں ہیں" بہ قول ڈاکٹر صاحب یہ صحیح نہیں، کیوں کہ سودا کی اصل میں بیس مثنویاں ہیں، باقی چار الحاقی ہیں، مولف نے اس کی تصریح یوں کی ہے کہ اس تعداد میں سودا کی مثنویاں، ہجویں اور پہیلیاں سب شامل ہیں، یہ بھی صحیح نہیں، کیوں کہ سودا کی ۱۰۹ پہیلیاں اور پچاس ہجویں ہیں۔ اسی باب میں آگے چل کر میر حسن کے بارے میں سکسینہ لکھتے ہیں:

> "میر حسن کی ولادت پرانی دلی کے محلہ سید واڑہ میں ۱۱۴۰ھ میں ہوئی اور بچپن میں درسی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ اور کلام بھی انہیں کو دکھایا اس کے بعد خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔"

(ایضاً، ص ۱۴۲)

اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ان تینوں باتوں کا ثبوت کسی معتبر اور مستند تذکرے سے نہیں ملتا اور حاشیے میں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ خود میر حسن نے میر ضیاء الدین کے

علاوہ کسی اور کی شاگردی کا اعتراف نہیں کیا۔ اسی سلسلے میں مولف مزید لکھتے ھیں کہ "بروقتِ وفات عمر پچاس سال سے متجاوز تھی۔ مصحفی نے تاریخ کہی 'شاعر شیریں بیان' جس سے تاریخ ۱۲۰۱ھ نکلتی ھے۔" (ایضاً، ص ۱۴۴)۔ جب کہ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ھے کہ مصحفی نے میر حسن کی تاریخ وفات "شاعر شیریں بیان" سے نہیں 'شاعر شیریں زبان' سے نکالی ھے۔ کیوں کہ پہلے فقرے کے اعداد "۱۲۰۴" ھوتے ھیں اور دوسرے کے اعداد "۱۲۰۱" جو میر حسن کا سال وفات ھے۔ آگے چل کر مولف میر حسن کی مثنویوں کے بارے میں لکھتے ھیں:

> "... دوسری مثنوی 'گل زار ارم' ھے، تیسری 'رموز العارفین' اس کا تذکرہ کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا، ان کے علاوہ اور بھی بعض مثنویاں بتائی جاتی ھیں جو اب ناپید ھیں۔" (ایضاً، ص ۱۶۳)۔

جب کہ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ھے کہ یہ "مثنویاں ناپید نہیں جیسا کہ سکسینہ نے لکھا ھے، اس سلسلے میں انھوں نے تلاش و تفحص سے کام نہیں لیا۔ کیوں کہ میر حسن کی تین مثنویاں اور بھی ھیں جو دستیاب ھیں۔" اسی باب میں آگے چل کر مولف نے "تذکرۃ الشعراء" کے بارے میں لکھا ھے کہ "اس کا سال تصنیف کہیں مذکور نہیں مگر ان تاریخوں سے جو خود تذکرے میں موجود ھیں ۱۱۹۴ھ بہت قرین قیاس معلوم ھوتا ھے۔" (ایضاً، ص ۱۶۴)۔ نیچے حاشیے میں درج ھے کہ "مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی 'تذکرہ شعرائے اردو' کے مقدمے میں لکھتے ھیں کہ "یہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا" (ایضاً، ص ۱۶۴)۔

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ میر حسن نے سودا کے تذکرے میں نواب شجاع الدولہ متوفی ۱۱۸۸ھ کو بہ قید حیات لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ سے قبل لکھنا شروع کیا گیا اور غالباً ۱۱۹۲ھ کے بعد تک لکھا جاتا رہا۔

آگے چل کر میر کے ذکر میں مولف لکھتے ہیں کہ "مگر 'ذکر میر' میں میر صاحب نے اپنے والد کا کوئی نام نہیں لکھا" (ایضاً، ص ۱۹۶) بہ قول ڈاکٹر صاحب یہ صحیح نہیں، کیوں کہ "ذکر میر" سے ثابت ہوتا ہے کہ میر کے والد کا نام "محمد علی" اور لقب محمد متقی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو سکسینہ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ "میر کے والد کا نام میر عبداللہ ہے"۔ یہاں پہنچ کر ڈاکٹر صاحب کو اس کتاب میں یہ کمی محسوس ہوئی کہ میر کے سفر لکھنؤ سے متعلق معلومات مکمل نہیں ہیں حتیٰ کہ یہ بھی کہ میر صاحب لکھنؤ کب روانہ ہوئے، سکسینہ نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ آگے چل کر سکسینہ کے دیے ہوئے سال وفات سے ڈاکٹر صاحب کو اتفاق ہے، لیکن دن، مہینے اور تاریخ کی کمی کی عدم موجودی کی انہیں شکایت ہے، جس کا ازالہ انھوں نے جناب قاضی عبدالودود کی تحقیق سے رجوع کر کے کر لیا، کہ ان کی تحقیق کے مطابق میر کا انتقال بروز جمعہ ۲۱ ماہ شعبان ۱۲۲۵ھ کو ہوا۔ مولف نے میر کا سال ولادت ۱۱۳۷ھ لکھا جب کہ صحیح ۱۱۳۵ھ ہے۔

اس کے بعد سکسینہ " نکات الشعراء " کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ " نہ کلام کی تنقید میں سختی اور بد دماغی سے کام لیا گیا ہے" (ایضاً، ص ۱۸۰) جب کہ ڈاکٹر صاحب کے مطابق "اکثر جگہ میر

صاحب کی تنقیدیں سخت ہوگئی ہیں بلکہ بعض جگہ تو ان کی نکتہ چینیاں جائز حدود سے بہت متجاوز کر گئی ہیں" اس سلسلے میں انھوں نے کئی مثالیں بھی دی ہیں۔ اسی باب میں "میر صاحب کی ایجادیں" کے ضمن میں مولف رقم طراز ہیں کہ "میر صاحب اردو واسوخت کے موجد تسلیم کئے گئے ہیں" (ایضاً، ص ۱۹۲) مولف کے اس بیان کا ماخذ آزاد کی "آب حیات" ہے اور یہ بات غلط ہے، کیوں کہ واسوخت کے موجد آبرو، متوفی ۱۱۴۶ھ ہیں نہ کہ میر، متوفی ۱۲۲۵ھ۔ آگے چل کر سکسینہ نے میر کے دعوے کے حوالے سے "نکات الشعراء" کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تذکرہ "شعرائے اردو کا سب سے پہلا تذکرہ ہے" (ایضاً، ص ۱۹۲) بہ قول ڈاکٹر صاحب "یہ دتاسی کے بیان سے ماخوذ ہے جو کہ صحیح نہیں، میر صاحب سے پہلے جو تذکرے لکھے گئے، ان میں تذکرہ سید امام الدین خان جو بہ عہد محمد شاہ لکھا گیا اور 'تذکرۂ سودا' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔"

"ساتواں باب" (اساتذۂ دھلی، طبقۂ متاخرین) میں انشاء کے بارے میں رقم طراز ہے کہ "انشاء مرشدآباد چھوڑ کر شاہ عالم کے زمانے میں دلی آئے" (ایضاً، ص ۲۱۰) بہ قول ڈاکٹر صاحب "یہ صحیح نہیں، کیوں کہ انشاء میر ماشاء اللہ کے ساتھ فیض آباد گئے اور وہاں کئی سال مقیم رہے اور اس کے بعد دھلی گئے"۔ اسی ضمن میں مولف مزید لکھتے ہیں۔

> "آخرکار دلی کی تباھی سے بد دل ہوکر اور نیز اس خیال سے کہ ان کی قابلیت کے موافق یہاں ان کی قدر نہیں ہوئی تھی اور خاص کر مرزا عظیم بیگ کے

مناقشے کی وجہ سے انشاء نے لکھنؤ کا رخ کیا، جو
اس زمانے میں دھلی سے نکلے ھوئے شعراء اور دیگر
با کمالوں کا ملجا و ماوا بنا ھوا تھا" (ایضاً، ص ۲۱۰)۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ ھے کہ مولف کا خیال ھے کہ جو باکمال دلی اجڑنے کے بعد لکھنؤ کی طرف ھجرت کر گئے تھے انہیں میں سے ایک انشاء بھی ھیں، یہ صحیح نہیں معلوم ھوتا، کیوں کہ انشاء کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب تک دھلی میں رھے، انشاء مرشد آباد سے شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد گئے اور ان کی وفات یعنی ۱۱۸۸ھ کے بعد وھاں سے رخصت ھوئے، ان کے کلام سے مختلف السنہ ھند سے واقفیت کا پتہ چلتا ھے، اور تعجب نہیں کہ کسی ایک مقام پر جم کر رھنے کے بجائے مختلف اقطاع ھند کی سیر کرتے رھے ھوں، دھلی میں ان کا قیام مسلم لیکن محض اس بناء پر ان کا شمار مہاجرین دھلی میں کیوں کر ھوسکتا ھے۔ نیز مولف نے عظیم بیگ کو تلمیذ مصحفی لکھا ھے۔ یہ صحت سے دور ھے۔ وہ سودا کے شاگرد تھے۔

اسی باب میں "دریائے لطافت" کے بارے میں مولف لکھتے ھیں کہ "اس کا سن تصنیف ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۲ء ھے" (ایضاً، ص ۲۲۲) بقول ڈاکٹر صاحب ۱۲۲۲ھ سن تصنیف نہیں بلکہ سن تکمیل ھے، کیوں کہ کتاب کا آغاز شاہ عالم ثانی کی زندگی ھی میں ھوچکا تھا۔ دوسری بات یہ ھے کہ ۱۲۲۲ھ کی مطابقت ۱۸۰۲ء کے ساتھ نہیں ھے آزاد نے ۱۸۰۷ء اور مولوی عبدالحق نے ۱۸۰۸ء لکھی ھے۔ آگے جرأت کے ذکر میں ان کا سال وفات ۱۲۲۵ھ لکھا ھے۔ بقول

ڈاکٹر صاحب یہ ایک عالم گیر غلطی ہے کیوں کہ بعض دوسرے حضرات نے بھی یہی لکھا ہے۔ جرأت کس تاریخ کو مرے یہ بتانا مشکل ہے، تاہم قاضی عبدالودود جنھوں نے تذکروں کی بہت سی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھائی ہیں، ان کا بیان ہے کہ جرأت ۱۱ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ سے قبل انتقال کرچکے تھے۔ اس کے بعد سکسینہ نے مزید لکھا ہے کہ جرأت:

"مرزا سلیمان شکوہ کے حاشیہ نشینوں میں داخل ہوئے اور آخر تک لکھنؤ ہی میں رہے اور وہیں وفات پائی۔" (ایضاً، ص ۲۲۵)۔

اس سلسلے میں اگر سکسینہ مصحفی کا "تذکرۂ ہندی" دیکھ لیتے تو ہرگز سلیمان شکوہ کی ملازمت والی بات نہ کرتے اور جرأت کی وفات کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ وہ بارھویں صدی کے خاتمے سے پہلے ہی لکھنؤ چھوڑ چکے تھے۔ آگے چل کر جرأت کی مثنوی "حسن و عشق" کے بارے میں مولف لکھتے ہیں کہ اس کا "سنِ تالیف ایک تاریخ سے ۱۲۲۵ھ، معلوم ہوتا ہے" (ایضاً، ص ۲۲۷)۔ بقول ڈاکٹر صاحب مولف کے اس بیان پر یقین کرنا مشکل ہے۔

صفحہ ۲۲۹، پر مولف نے مصحفی کا سال ولادت ۱۱۶۴ھ لکھا ہے، اور کوئی دلیل نہیں دی، اس کے بعد مزید رقم طراز ہیں کہ "آغازِ جوانی میں وطن چھوڑ کر ۱۱۹۰ھ میں دھلی آئے" (ایضاً، ص ۲۲۹) واضح رہے کہ امروھے سے روانگی کے وقت مصحفی کی عمر تیس سال سے زائد تھی اور ۱۱۹۰ھ والی بات بھی درست نہیں ہے کہ مصحفی ۱۱۹۰ھ سے دو، تین سال پہلے یعنی ۱۱۸۶ھ میں دھلی پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ روانگی سے

متعلق مولف لکھتے ھیں کہ "بارہ برس دلی" میں رہ کر مثل اور شعراء کے لکھنؤ آئے" (ایضاً، ص ۲۳۰) حالاں کہ ابھی پچھلے صفحے پر خود سکسینہ نے لکھا ھے کہ ۱۱۹۰ھ میں دلی آئے، اس میں بارہ برس جمع کرنے کے بعد ۱۲۰۲ھ مصحفی کے لکھنو آنے کا سال قرار پاتا ھے جو کہ غلط ھے۔ صحیح ۱۱۹۸ھ ھے۔ تصانیف کے ذیل میں مولف مزید لکھتے ھیں کہ "ایک تذکرہ فارسی شعراء کا اور ایک اردو شعراء کا فارسی زبان میں لکھا" (ایضاً، ص ۲۳۰) بقول ڈاکٹر صاحب مصحفی نے اردو شعراء کے حالات میں ایک سے زائد تذکرے لکھے ھیں مثلاً: "تذکرۂ ھندی" "ریاض الفصحا" اور "عقد ثریا"۔ سکسینہ نے شاہ نامے سے متعلق لکھا ھے "شاہ نامے کا ایک حصہ بھی لکھا ھے جس میں شاہ عالم کے خاندان تک کے حالات درج ھیں" (ایضاً، ص۲۳۰) جب کہ ڈاکٹر صاحب نے خود مصحفی کے حوالے سے لکھا ھے کہ انھوں نے شاہ عالم کی بھی پوری حالت نہیں لکھی تھی صرف نسب نامہ شروع کیا تھا، خاندان شاہ عالم ابھی بہت دور تھا۔

"تذکرۂ ھندی" کے متعلق مولف کا بیان ھے کہ "اس میں تقریباً ساڑھے تین سو شعراء کا ذکر ھے"۔ (ایضاً، ص ۲۳۱) بقول ڈاکٹر صاحب ساڑھے تین سو تو بہت ھوتے ھیں اس میں پورے دو سو شاعروں کا ذکر بھی نہیں ھے۔ اسی تذکرے سے متعلق مولف مزید رقم طراز ھیں کہ "یہ تذکرہ ان کے شاگرد میر مستحسن خلیق کی خاص فرمائش سے لکھا گیا" (ایضاً، ص ۲۳۰) بقول ڈاکٹر صاحب بہ ظاھر مولف کو اس کا یقین نہیں یا کم از کم انھوں نے

"تذکرہ ہندی" کا مطالعہ نہیں کیا۔ اگر مولف "تذکرہ ہندی" کا دیباچہ پڑھ لیتے تو یہ بات ہرگز نہ لکھتے۔ اسی صفحے پر مزید رقم طراز ہیں کہ "مشاعروں کے لیے بہ کثرت غزلیں کہہ کر رکھتے تھے، معمولی خریداروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے اور منتخب اشعار اپنے لیے رکھ لیتے" (ایضاً، ص ۲۳۱) یہ بھی آزاد کے بیان سے ماخوذ ہے اور غلط ہے۔ اگلے صفحے پر سکسینہ نے عیشی کو مصحفی کا شاگرد لکھا ہے۔ حالانکہ خود مصحفی کا بیان ہے کہ عیشی اپنے وقت کے استاد تھے، پھر مصحفی نے اپنے تذکرے میں ان کی شاگردی کا ذکر نہیں کیا۔ ان کا حال " ریاض الفصحا " میں موجود ہے اس میں ان کے متعلق جن الفاظ اور جس تیور سے لکھا ہے، ایک استاد اپنے شاگرد کو کبھی نہیں لکھ سکتا۔ آگے چل کر مولف مزید رقم طراز ہیں کہ:

> "ناسخ کی نسبت مشہور ہے کہ ان کو کسی سے فخر تلمذ نہیں تھا، مگر وہ بھی . . . اسی (مصحفی کے) مائدہ سخن کے ریزہ چین ثابت ہوتے ہیں، جیسا کہ خود مصحفی نے اپنے چھٹے دیوان کے دیباچے میں ان کی نسبت لکھا ہے"۔ (ایضاً، ص ۲۳۲)۔

بہ قول ڈاکٹر صاحب متاخرین میں سے بعض نے ناسخ کو مصحفی کا شاگرد لکھاہے، لیکن خود مصحفی نے "ریاض الفصحا" میں اس کا ذکر نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو مصحفی اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔ اور رہا سوال دیوان ششم کا تو اس میں انھوں نے ناسخ کو اپنے شاگرد تنہا کا دوست ضرور لکھا ہے اپنا شاگرد نہیں، اور لفظ "دوست" یا "یار" تذکرہ نگاروں نے شاگرد کے معنوں میں استعمال کیا

ہے لیکن التزاماً نہیں۔ اس لیے محض اس بناء پر ناسخ کو مصحفی کا شاگرد قرار دینا صحیح نہیں۔ "مصحفی اور سید انشاء کے معرکے" کے ذیل میں مولف کا بیان ہے:

> "میاں مصحفی پہلے شہزادہ سلیمان شکوہ کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ جب سید انشاء پہنچے تو ان کے سامنے ان کا رنگ کب جم سکتا تھا، چناں چہ اب غزلیں انشاء کے پاس آنے لگیں، جس سے شاید مصحفی کو بڑا قلق ہوا"۔ (ایضاً، ص ۲۳۴)

اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ یہ قطعاً صحیح نہیں کیوں کہ "تذکرہ ہندی" میں اس کی تصریح ہے کہ دربار میں سید انشاء کی رسائی مصحفی سے پہلے ہوچکی تھی۔ بلکہ انشاء کے ذریعے مصحفی کو دربارِ سلیمان شکوہ میں جگہ ملی۔ اس صورت میں یہ "معرکہ" ہی خارج از بحث ہوجاتا ہے۔ صفحہ ۲۳۷ پر سکسینہ نے رنگین کا سالِ ولادت ۱۱۲۹ ھ لکھا ہے جو کہ غلط ہے کیوں کہ اب یہ ثابت ہوچکا ہے کہ رنگین کا سال ولادت ۱۱۷۱ ھ ہے اور بہ قول ڈاکٹر صاحب یہ بھی صحیح نہیں کہ رنگین مصحفی سے اصلاح لیتے تھے، نیز رنگین کی تصانیف کی فہرست بھی نامکمل ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۲۴۵ پر قائم کا نام "شیخ قیام الدین" لکھا گیا ہے، جب کہ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ قائم کے صحیح نام کے سلسلے میں تذکرہ نویسوں کا اختلاف ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کا نام محمد قیام الدین تھا، اس کا اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکتا کہ وہ خود اپنے تذکرے "مخزن نکات" کے دیباچے میں یہی نام لکھتے ہیں۔ آگے چل کر سکسینہ مزید

لکھتے ھیں کہ "قطعات اور رباعیات میں یدطولیٰ رکھتے تھے" (ایضاً، ص ۲۴۵) بہ قول ڈاکٹر صاحب "مولف کی اس رائے سے اتفاق مشکل ھے ان (قائم) کی تعریف شیفتہ کے علاوہ کسی اور تذکرہ نگار نے نہیں کی اور رہے شیفتہ وہ کوئی معتبر تذکرہ نگار نہیں اور صحیح مان لینے کی صورت میں بھی ظاھر ھے کہ وہ صرف شیفتہ کی اپنی رائے ھوگی"۔ آگے چل کر تذکرے کے متعلق لکھتے ھیں کہ "انھوں نے ایک تذکرہ بھی لکھا ھے جو کم یاب ھے" (ایضاً، ص ۲۴۵) یہاں مولف کا اشارہ "مخزن نکات" کی طرف ھے تو وہ اب کم یاب نہیں رہا، انجمن ترقیٔ اردو کی مساعی سے شائع ھوچکا ھے۔ قائم کا سالِ وفات سکسینہ نے ۱۲۱۰ ھ لکھا ھے جوکہ صحیح نہیں اس لیے کہ مصحفی نے انھیں "تذکرہ ھندی، ۱۲۰۹ ھ" میں مرحوم لکھا ھے۔ گویا وہ ۱۲۰۹ ھ سے پہلے یعنی ۱۲۰۸ ھ میں وفات پاچکے تھے۔ ثبوت میں جرأت کا ایک قطعہ بھی پیش کیا جاسکتا ھے جس سے ۱۲۰۸ ھ مستخرج ھوتا ھے۔

سکسینہ نے حسرت کے بارے میں لکھا ھے کہ "وہ رائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے" جب کہ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ھے کہ ان کا صحیح نام رائے سرپ سکھ تھا۔ اس کے علاوہ صفحہ ۲۵۲، پر سکسینہ نے ھدایت اللہ خان دھلوی کا سالِ وفات ۱۲۱۵ھ لکھا ھے، جس کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال ھے کہ یہ صحت سے دور ھے ان کے صحیح سالِ وفات کا تعین مشکل ھے ھاں قرائن کی بناء پر کچھ کہا جاسکتا ھے۔ قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرے "مجموعہ نغز" مصنفہ ۱۲۲۱ھ میں انھیں مرحوم و مغفور لکھتے ھیں۔ اس سے معلوم ھوتاھے کہ ھدایت دھلوی ۱۲۲۱ ھ سے قبل وفات پاچکے تھے۔ صفحہ ۲۵۶ پر سکسینہ نے راسخ

عظیم‌آبادی کا سالِ ولادت ۱۱۶۲ھ لکھا ہے، ہر چند کہ عام طور پر یہی مشہور ہے لیکن یہ صحیح نہیں ان کے سال ولادت کے سلسلے میں ۱۱۷۰ھ زیادہ قرین قیاس ہے۔ اسی صفحے پر سکسینہ مزید لکھتے ہیں کہ "۶۷ برس کی عمر پاکر ۱۲۳۸ھ یا ۱۲۴۰ھ میں وفات پائی" (ایضاً، ص ۵۶)۔ جب کہ راسخ عظیم آبادی نے ۶۸ برس کی عمر پاکر ۱۲۳۸ھ میں انتقال کیا۔ واضح رہے اس سلسلے میں سکسینہ نے اپنی کوئی رائے نہیں دی تھی صرف دو اقوال نقل کردیے تھے اور صحیح عمر کا تعین بھی نہیں کرسکے تھے۔

یہ تھا ڈاکٹر آرزو کے اس طویل اور مفصل مضمون کا خلاصہ جو "تاریخ ادب اردو" کے چند ابواب کا احاطہ کرتا ہے اور جس میں ڈاکٹر صاحب نے ہر قسم کی اغلاط کی نشان دہی اور تصحیح کے ساتھ ساتھ جا بہ جا اضافی معلومات سے بھی نوازا ہے، جن کے مطالعے سے تاریخ زبان و ادب کے ایک سنجیدہ طالب علم کے ذہن میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کا پس منظر مزید واضح اور مربوط ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر وجہی کی دوسری مثنوی "قطب مشتری" سنہ اتمام ۱۰۱۸ھ اور نصرتی کی تیسری مثنوی "تاریخ اسکندری" جس کا صرف ایک ہی نسخہ ہے نیز نصرتی کے قصائد جن کے بارے میں سکسینہ خاموش ہیں۔ ان اضافی معلومات میں سے بعض کے لیے ہمیں جدید تحقیق کا احسان مند ہونا چاہیے مثلاً: بحری کا ایک "دیوان" اور "ھنگار نامہ" جو بعد کی تحقیق سے دریافت ہوا ہے۔ اس کے علاوہ "دیوانِ تاباں" اور مصحفی کی مثنویاں اور مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کا فارسی دیوان اور اردو کی ایک مثنوی وغیرہ جو کہ سکسینہ کی تاریخ کی تصنیف تک دریافت نہیں ہوئی تھیں مگر جن کا علم لوگوں کو

اب لازمی طور پر ہونا چاہیے، ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی و تنقیدی مضمون کی بدولت پہلی مرتبہ قارئین کے علم میں آئیں۔ ہر چند کہ ان قیمتی معلومات سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا، ورنہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ زیر مطالعہ تاریخ کی نئی اشاعت کے وقت ڈاکٹر صاحب کے مضمون کو پیش نظر رکھ کر اس میں فراہم کی گئی معلومات کی روشنی میں وہ خلا پر کیے جاتے جو پہلے اصل کتاب میں اور پھر اس کے ترجمے میں رہ گئے تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی بصیرت اور تحقیقی کاوشوں کی داد دی جاتی، کہ انھوں نے اُس وقت اِس معیار کا مقالہ قلم بند کیا جب اردو تحقیق نے اتنی ترقی نہیں کی تھی جتنی کہ اب کرلی ہے۔

(۲)

سکسینہ کے ناقدین میں ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو کے بعد دوسرا اہم نام ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا ہے، جنھوں نے اپنے مقدمے کے آغاز میں چند نظریاتی اختلافات کی نشان دھی کی ہے۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ سکسینہ نے اپنی کتاب کے "پہلے باب" (اردو زبان اور اس کی اصل) میں اردو زبان کی ابتدا سے متعلق لکھا ہے:

> "زبان اردو اس ہندی بھاشا کی ایک الگ شاخ ہے، جو صدیوں تک دھلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شورسینی پراکرت سے بلاواسطہ تھا، یہ بھاشا جس کو ہندی کہنا بجا ہے، زبان اردو کی اصل اور ماں سمجھی جاتی ہے" (ایضاً، ص ۱)۔

باوجود اس کے کہ یہ خود ایک اختلافی بحث ہے لیکن اس سے قطع نظر "باب دوم" (زرین عہدِ اکبری)

کے ضمن میں رقم طراز ہیں "چوں کہ فاتح اور مفتوح دونوں قوموں میں دلی یک جہتی اور اتحاد تھا اس وجہ سے زبانوں میں بھی اتحاد پیدا ہوا اور کئی زبانوں سے مل کر ایک نئی زبان پیدا ہو گئی" (ایضاً، ص ۲۱)۔

واضح رہے کہ انہی بیانات پر سکسینہ میر امن اور دوسرے قدیم نثرنگاروں کو غلط قرار دے کر خود وہی غلطی دہرا رہے ہیں۔ "تیسرے باب" (اردو شاعری کی عام خصوصیات) میں سکسینہ نے جو فیصلے صادر کیے ہیں، ان کو یا تو آج یکسر رد کیا جاچکا ہے یا من و عن قبول نہیں کیا جاتا، مثلاً:

" اردو شاعری فارسی شاعری کی مقلد ہے" (ایضاً، ص ۴۱)۔
" اردو شاعری محض نقالی ہے" (ایضاً، ص ۴۲)۔
" اردو شاعری صرف رسمی رہ گئی ہے" (ایضاً، ص ۴۳)۔
" تمام قدیمی شعرائے اردو صوفی تھے" (ایضاً، ص ۴۷)۔
" اردو شاعری اہل دربار میں ہمیشہ مرغوب اور ہر دل عزیز رہی ہے اور امرأ اور رؤسا کے درباروں میں اس کی ترقی اور نشو و نما ہوئی" (ایضاً، ص ۴۹)۔

ہر چند کہ سکسینہ کے مذکورہ فیصلوں کی بنیاد ان کے ذاتی نظریات پر ہے، لیکن ان کے یک طرفہ ہونے میں کسی کو بھی شبہ نہیں ہوسکتا۔ یہ فیصلے ممکن ہے کہ جزوی طور پر کسی حوالے سے صادق آجائیں لیکن پوری اردو شاعری پر ان کا اطلاق کسی صورت نہیں ہوسکتا۔ دورِ جدید کے طالب علم کی صحیح رہنمائی کے لیے ضروری ہے کہ ان کی توضیحات کی جائیں۔ مذکورہ

نظریاتی اختلافات کے علاوہ کچھ تحقیقی اغلاط بھی سکسینہ سے سرزد ہوئی ہیں مثلاً "پندرھویں باب" (نثر اردو کی ابتدا اور ترقی) جان گل کرسٹ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"جان گل کرسٹ جو انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کے منتظم اعلیٰ تھے . . . الخ" (ایضاً، ص ۵)۔

"لارڈ ولزلی نے . . . گل کرسٹ کے مفید کاموں کے نتائج دیکھ کر ان کی مالی امداد بھی بہت کی اور فورٹ ولیم کالج کا افسر اعلیٰ مقرر کردیا"۔ (ایضاً، ص ٦)

فورٹ ولیم کالج میں گل کرسٹ کی حیثیت سے متعلق یہ ایک عام مغالطہ ہے جس میں سکسینہ بھی مبتلا ہیں۔ بہ قول ڈاکٹر ذوالفقار مولف نے یہاں پرنسپل تو نہیں لکھا جیسا کہ بعض دوسرے صاحبان نے لکھا ہے لیکن گل کرسٹ کو کالج کا منتظم اعلیٰ اور افسر اعلیٰ بنا کر ان کی تائید ضرور کردی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گل کرسٹ کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر اور سربراہ تھے، ورنہ کالج میں عربی، سنسکرت اور قانون وغیرہ کے شعبے بھی تھے جن کے پروفیسر اور سربراہ گل کرسٹ سے زیادہ تنخواہ پاتے تھے۔ "سولھویں باب" (نثر اردو کا دور متوسط اور دور جدید) میں مرزا غالب کے اردو خطوط کا ذکر کرتے ہوئے مولف رقم طراز ہیں کہ:

"۱۸۵۰ء تک مرزا فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے، جیسا کہ ان کے خطوط سے پایا جاتا ہے جو "پنج آھنگ" میں چھپے ہیں۔ اور نیز بعض جگہ خطوط اردو میں بھی

اس کا ذکر ہے ، اس کے بعد انھوں نے اردو میں خطوط
لکھنا شروع کیے"۔ (ایضاً، ص ۲۹)

سکسینہ کے اس قیاس کو کہ غالب نے ۱۸۵۰ء کے بعد اردو میں خطوط لکھنے شروع کیے ۔ بعد کی حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں مارچ ۱۸۴۸ء تک پیچھے ہٹایا جاسکتا ہے ۔ غالب کے خطوط کا ایک مجموعہ " نادرات غالب " کے نام سے ۱۹۴۹ء میں مشہور پریس ، کراچی سے شایع ہوچکا ہے ، جسے آفاق نبیرۂ میرن صاحب نے مرتب کیا ہے ، یہ خطوط جو ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۹ء کے دوران لکھے گئے انھیں ترکے میں ملے تھے۔ اس مجموعے میں شامل ہیں "پہلا خط فارسی میں ہے اور 'پنج آہنگ' میں شامل ہے دوسرا خط اردو میں ہے اور ۹ مارچ ۱۹۴۸ء کا محررہ ہے ، یعنی غالب کے موجودہ اردو خطوط میں یہ پہلا اردو خط ہے"۔[۱] اسی باب میں ڈپٹی نذیراحمد دھلوی کے بارے میں مولف لکھتے ہیں :

" شمس العلماء خان بہادر مولانا نذیر احمد . . . دہلی
کالج کے مشہور پروفیسر عربی مولوی مملوک علی کے
اصرار سے دہلی کالج میں داخل ہوئے "۔ (ایضاً، ص ۵۵)۔

ڈاکٹر ذوالفقار کے مطابق دلی کالج میں نذیر احمد کے داخلے کا واقعہ "حیات النذیر"، "نذیراحمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی" مولفہ فرحت اللہ بیگ اور "مولوی نذیر احمد دھلوی ۔ احوال و آثار" از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے، ان کی روشنی میں نذیراحمد کے داخلے کے لیے مولوی مملوک علی

۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار : " محاسنِ خطوطِ غالب"، طبع اول،
لاھور، مکتبۂ خیابان ادب، ۱۹۶۹ء ، ص ۹ ۔

کا اصرار کرنا بے محل اور بے بنیاد ہے۔ آگے چل کر "سترھویں باب" (اردو ناول کی ابتداء) میں نواب سید محمد آزاد کے متعلق مولف لکھتے ہیں:

"آپ انگلستان بھی گئے تھے اور وہاں سے جو خطوط بھیجے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں"۔ (ایضاً، ص ۱۰۷)۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آزاد کبھی انگلستان گئے ہی نہیں۔ مولف کو جن خطوط سے یہ دھوکا ہوا ہے وہ دراصل ان معنوں میں خط ہی نہیں ہیں۔ یہ تو خط نما انشائیے ہیں جو انہوں نے مغربی تہذیب و معاشرت کے بارے میں وقتاً فوقتاً "اودھ پنچ" اور دوسرے جرائد میں لکھے، یہ خطوط ان کے مجموعہ مضامین "خیالاتِ آزاد" میں شامل ہیں۔ یہ تھیں چند مثالیں جو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے مقدمے میں سے پیش کی گئیں۔

(۳)

ان کے علاوہ بھی بہت سی فروگذاشتیں ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مثلاً "پانچویں باب" (اساتذۂ دھلی، طبقہ متقدین) میں سراج الدین خان آرزو کے ذکر میں لکھا ہے:

"نادر شاہ کے حملۂ دھلی اور تباھیٔ شہر کے بعد نواب سالار جنگ کے مشورے سے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آئے" (ایضاً، ص ۱۰۱)۔

لیکن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اپنی کتاب لکھنؤ کا دبستانِ شاعری میں رقم طراز ہیں "..... جب دہلی کی ویرانی سے گھبرا گئے تو سالار جنگ کی تحریک پر فیض آباد چلے گئے"۔[۱] ظاہر ہے کہ شجاع الدولہ

۱- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی: "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، لاھور، اردو مرکز، سن، ن، ص ۸۳۔

اس وقت تک فیض آباد میں رہتے تھے، لکھنؤ کی حیثیت ایک قصبے سے زیادہ نہ تھی۔ آگے چل کر "آٹھویں باب" (اساتذۂ لکھنؤ) میں رشک کے ذکر میں مولف رقم طراز ھیں:

"ان کے دو دیوان بھی ھیں، جن کے علی الترتیب تاریخی نام 'نظمِ مبارک' (۱۲۵۳ھ) اور 'نظم گرامی' (۱۲۶۱ھ) ھیں"۔ (ایضاً، ص ۲۷۷)۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مولف "گل رعنا" کے حوالے سے لکھتے ھیں کہ ایک تیسرا دیوان اور تھا، جو ضائع ھوگیا اور جس کی نسبت کہا جاتا ھے کہ ان دونوں سے اچھا تھا، خوش قسمتی سے دورانِ مطالعہ ڈاکٹر صاحب کو یہ نایاب قلمی دیوان جو اب تک ناپید سمجھا جاتا تھا دستیاب ھوگیا ھے۔[۱] اسی باب میں آگے چل کر منیر شکوہ آبادی کے سلسلے میں سکسینہ کا بیان ھے کہ:

"بعد غدر ایک رنڈی مسمات نواب کے قتل کی سازش میں ان پر مقدمہ قائم ھوا اور کالے پانی کی سزا تجویز ھوئی، مگر ۱۸۶۰ء میں قید سے رہائی پائی"۔ (ایضاً، ص ۲۰۲)۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا بیان ھے کہ "منیر کی قید کا واقعہ درست ھے لیکن جس طرح سکسینہ یا بعض اور مصنفین نے لکھا ھے اس طرح نہیں"۔[۲] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ھو "لکھنؤ کا دبستان شاعری" (صفحہ ۴۲۷) آگے چل کر "نویں باب" (دربارِ

۱۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی: "لکھنؤ کا دبستان شاعری"، لاھور، اردو مرکز، سن، ن، ص ۳۱۶۔

۲۔ ایضاً، ص ۴۲۷۔

لکھنؤ اور اس کے شعراء) میں واجد علی شاہ اختر کے ذکر میں ان کی تصنیف "حزنِ اختر" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سلطانِ عالم نے جو سفر لکھنؤ سے کلکتہ تک کیا تھا اس کا مختصر حال اپنی ایک مثنوی میں جس کا نام 'حزنِ اختری' ہے قلم بند کیا ہے"۔ (ایضاً، ص ۳۰۰)۔

حالانکہ اس مثنوی کا اصل نام "حزنِ اختر"[۱] سالِ تکمیل ۱۲۶۶ھ ہے، یہ مثنوی سب سے پہلے ۱۲۷۶ھ میں شایع ہوئی۔ آگے چل کر حصہ نثر، "پندرھویں باب" (نثر اردو کی ابتداء اور ترقی) میں حیدر بخش حیدری کے ذکر میں "طوطا کہانی" کی بابت رقم طراز ہیں کہ "... دوسرا 'طوطی نامہ' پینتیس ۳۵ قصص کا سید محمد قادری نے ۹۴-۱۷۹۳ء میں مختصر اور صاف کر کے ترتیب دیا"۔ (ایضاً، ص ۱۰)۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جین کا کہنا یہ ہے کہ:

"ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس کا سنِ تالیف ۱۰۹۳ھ درج کیا ہے، چوں کہ اس کے دکنی ترجمے مخزونہ عثمانیہ یونیورسٹی کی تاریخ ۱۱۴۲ھ، مطابق ۳۰-۱۷۲۹ء ہے"۔

اس لیے رام بابو سکسینہ کی درج کردہ تاریخ ۱۷۹۲ء صریحاً غلط ہے۔[۲]

۱- ڈاکٹر فرمان فتح پوری: "اردو کی منظوم داستانیں"، طبع اول، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۷۱ء، ص ۳۷۶۔
۲- ڈاکٹر گیان چند جین: "اردو کی نثری داستانیں"، طبع دوم، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۶۹ء، ص ۳۱۷۔

اسی باب میں نہال چند لاہوری کی تصانیف کے ذیل میں مولف لکھتے ہیں کہ: "'مذہبِ عشق' (جو تاریخی نام ہے) معرف بہ قصۂ 'گل بکاولی' جو شیخ عزت اللہ بنگالی کے اسی نام کے فارسی قصے مصنفہ ۱۱۲۴ھ کا اردو ترجمہ ہے" (ایضاً، ص ۱۲) "مذہبِ عشق" معروف بہ "قصۂ گل بکاولی" کا یہی سن تصنیف "طبقات الشعرائے ہند" میں کریم الدین احمد نے لکھا ہے جو کہ غلط ہے بہ قول ڈاکٹر گیان چند جین:

> "عزت اللہ کی فارسی نثر کا ایک مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں ہے، فہرست مخطوطات کے مرتب نے اس کی تاریخ تصنیف ۱۱۳۴ھ مطابق ۱۷۲۲ء دی ہے جس کی تائید انڈیا آفس فارسی مخطوطات کے فہرست نگار ڈاکٹر ایتھے کے بیان سے بھی ہوتی ہے"۔[۱]

صفحہ ۲۰۹ پر مولانا نذیراحمد کے ذکر میں ان کی تصانیف کے ضمن میں دیگر کتب کے ساتھ ایک کتاب کا نام "افسانۂ غذر" لکھا ہے، جب کہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اپنے مقالے میں اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے ذیلی عنوان "مصائب غذر" قائم کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے صرف "دو ایڈیشن شایع ہوئے تھے . . . پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ رضا لائبریری، رام پور میں ہے"[۲] اس کے سر ورق پر جو عبارت درج ہے اس سے بھی اسی نام کی تصدیق ہوتی ہے۔

۱۔ ڈاکٹر گیان چند جین: "اردو کی نثری داستانیں"، طبع دوم، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۶۹ء، ص ۲۱۲۔

۲۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: "مولوی نذیراحمد دہلوی احوال و آثار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۱ء، ص ۲۰۸۔

ان چند مثالوں کے علاوہ اور بھی کئی ایک الزامات ہیں جو سکسینہ پر لگائے جاتے ہیں، مثلاً ایک تو یہی کہ ممدوحین کے بارے میں ان کی کوئی ذاتی رائے نہیں ہے، بلکہ اکثر مقامات پر وہ آزاد ہی کی رائے کو اپنی رائے کے طور پر پیش کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں سید محمد عقیل نے اپنے مضمون "ہماری ادبی تاریخیں" مشمولہ مُشرب، کراچی میں کئی مثالیں بھی پیش کی ہیں، جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سکسینہ نے بالکل مشرقی طرز کی تنقید کا انداز اپنایا ہے اور تاثراتی اور روایتی اصطلاحات تنقید پر زور دیا ہے۔ باوجود اس کے کہ سکسینہ نے یہ کتاب انگریزی ادب کی تاریخوں سے متاثر ہوکر اور انہیں سامنے رکھ کر لکھی لیکن انگریزی تاریخوں کا معیار تنقید نہیں اپنا سکے۔ اسی موضوع پر مزید گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی فرماتے ہیں:

> "تاریخ ادب اردو" کی تنقید میں حالات کا کہیں تجزیہ نہیں۔ معاشرے کے پس منظر میں ادبی شاہ کاروں کی جانچ پڑتال کم نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی تنقید کو سائنٹیفک تنقید اور موجودہ اصول تنقید کے مطابق نہیں کیا جا سکتا"۔۲

لیکن ان تمام باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اب سکسینہ

۱۔ سید محمد عقیل: "ہماری ادبی تاریخیں"، ماہنامہ، "مشرب" کراچی، بابت جون، جولائی، ۱۹۵۶ء، ص ۹۳۹۔

۲۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی: "اردو تنقید کا ارتقاء"، طبع سوم، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو ۸۰-۱۹۷۹ء، ص ۳۵۸۔

کی اس تصنیف کی اہمیت و افادیت ختم ہو گئی ہے ، لیکن اتنا ضرور ہے کہ مذکورہ باتوں کے پیش نظر قاری کو اس کتاب کا مطالعہ ذرا احتیاط سے کرنا چاہیے ، کیوں کہ اب بھی یہ کتاب اردو ادب اور اس کے مختلف ادوار کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات سے پُر ہے ، اور جس زمانے میں یہ پہلی بار منظر عام پر آئی تھی اس وقت تو بہ قول مبصر "سہ ماہی اردو" ، "اردو ادب کی تاریخ پر اس وقت اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں تھی،"۔۱ یہی وجہ ہے کہ بعد کے کئی تاریخ دانوں نے اِسے ایک " مستند ماخذ" کے طور پر برتا اور بعض نے تو اس حد تک استفادہ کیا کہ ان کی تصانیف پر " ترجمے" ، "خلاصے" اور "سکسینہ صاحب کی تصنیف کی آوازِ بازگشت کا گمان" ہوتا ہے"۔۲

اب جب کہ تحقیق کا فن پہلے کے مقابلے میں بےحد ترقی کرچکا ہے اور نئے مواد و ماخذات کی دستیابی سے ، تاریخ ادب کے تاریک گوشے منور ہوچکے ہیں ، کئی غلطیوں کی تصحیح اور کئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوچکا ہے ، پھر بھی سکسینہ کی یہ تصنیف اپنے پرانے اسلوب کے ساتھ زندہ ہے تو اس میں سکسینہ اور عسکری کے بعد اس کتاب کے ضمیمہ نگار ڈاکٹر اعجاز حسین اور مرتبین جن میں قیوم نظامی اور تبسم کاشمیری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ، کی کوششوں کا بھی بڑا دخل ہے ، کیوں کہ

۱- مبصر: "رسالہ اردو" ، سہ ماہی ، اورنگ آباد ، دکن ، انجمن ترقیٔ اردو ، بابت اکتوبر ۱۹۲۹ء ، ص ۲۹۲ -

۲- مخمور اکبرآبادی : مقدمہ "صحیفہ تاریخ اردو"، آگرہ ، گیاپرشاد اینڈ سنز ، ۱۹۴۶ء ، ص ۲۷ -

انھی کی تعلیقات اور ترتیب نے " اس مفید کتاب کو مفید تر بنادیا"۔
اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔

(۴)

تبسم کاشمیری کے درج کردہ حواشی میں جن اغلاط کی نشان دھی کی گئی ھے ، ان میں بیش تر تو وھی ھیں جن کی صراحت ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار پہلے ھی کرچکے ھیں، چند تصریحات جن کی نشان دھی تبسم کاشمیری نے اپنے طور پر کی ھے ، ملخصاً ذیل میں پیش کی جاتی ھیں۔

صفحہ ۶۵، پر قطب شاہ کے بارے میں سکسینہ کا بیان ھے کہ "قطب شاہ پہلے شخص ھیں جن کا کلام اردو مجموعی صورت میں موجود ھے . . . ممکن ھے ان سے بھی پیش تر کچھ لوگ گزرے ھوں" جب کہ اس سلسلے میں تبسم کاشمیری کا کہنا ھے کہ محمد قلی قطب شاہ سے پہلے کے تین شعراء یعنی ملا خیالی، سید محمود اور فیروز کا سراغ ملتا ھے۔ آگے چل کر صفحہ ۷۲، پر سکسینہ مزید رقم طراز ھیں کہ قطبی نے "۱۰۳۶ھ میں 'تحفتہ النصائح' کا ترجمہ فارسی زبان سے دکھنی میں کیا" حالانکہ یہ ترجمہ ۱۰۴۵ھ مطابق ۳۶-۱۶۳۵ء میں کیا گیا۔ اس کے علاوہ اسی صفحے پر جنیدی کے بارے میں سکسینہ نے بہت کم معلومات فراہم کی ھیں، جب کہ تبسم کاشمیری نے اس بارے میں کئی تفصیلات دی ھیں اور ان کی مثنوی "ماہ پیکر" کا صحیح سنِ تصنیف ۱۰۵۴ھ مطابق ۱۶۵۴ء بتایا ھے۔ ۲

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: "تاریخ ادب اردو، اہلِ نظر کی رائے میں" مشمولہ تاریخ ادب اردو، مرتبہ تبسم کاشمیری، لاہور، علمی کتاب خانہ، ۱۹۸۱، ص ص۔

۲۔ واضح رھے دونوں سنین میں مطابقت نہیں ھے کیونکہ ۱۰۵۴ھ کی مطابقت ۴۵-۱۶۴۴ء سے ھے۔ سلیم

اسی صفحے پر آگے چل کر تبسم کاشمیری نے طبعی کے حالاتِ زندگی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ان کی مثنوی کا نام "مثنوی بہرام گل اندام" لکھا ہے جب کہ اس کا صحیح نام "بہرام و گل اندام"، ہے۔ حصہ نثر کے صفحہ ۲ پر سکسینہ نے شیخ عین الدین گنج العلم کا سالِ وفات ۷۹۵ھ لکھا ہے - جس کی مطابقت ۹۳-۱۳۹۲ء سے ہوتی ہے۔ جب کہ تبسم کاشمیری کا بیان ہے کہ ان کا انتقال ۱۳۹۶ء میں ہوا، جس کی مطابقت ۹۹-۷۹۸ھ سے ہوتی ہے جو کہ غلط ہے۔ سکسینہ کے دیے ہوئے سن کی تصدیق دیگر محتاط محققین حکیم شمس اللہ قادری ۲ اور ڈاکٹر جمیل جالبی ۳ کی تصانیف سے بھی ہوتی ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔

یہ اور ان کے علاوہ، اور بھی بہ کثرت مفید معلومات تبسم کاشمیری نے حواشی میں درج کی ہیں، ہرچند کہ ان میں سے بیش تر معلومات وہ ہیں جو سکسینہ کے بعد کی تحقیق کے ذریعے حاصل ہوئی ہیں، اس لیے "تاریخ ادب اردو" میں ان کی کمی سکسینہ پر اعتراض کا جواز نہیں بنتی، لیکن پھر بھی تاریخ ادب کے طالب علم کے لیے ان کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۱- رام بابو سکسینہ: "تاریخ ادب اردو"، مترجمہ عسکری، لکھنؤ، نول کشور پریس، ص ۷۲-

۲- حکیم شمس اللہ قادری: "اردوئے قدیم"، طبع دوم، لکھنؤ، نول کشور پریس، ۱۹۳۰ء، ص ۳۰-

۳- ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخ ادب اردو"، (جلد اوّل) طبع دوم، لاهور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء، ص ۱۵۹-

کتابیات

۱- آزاد، محمد حسین: "آب حیات"، طبع شانزدہم، لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۵۴ء۔

۲- ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: "لکھنؤ کا دبستان شاعری"، لاہور، اردو مرکز، سن ن۔

۳- افتخاراحمد صدیقی، ڈاکٹر: "مولوی نذیراحمد دہلوی احوال و آثار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۱ء۔

۴- جمیل جالبی، ڈاکٹر: "تاریخ ادب اردو"، (جلد اول)، طبع دوم، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۸۴ء۔

۵- سکسینہ، رام بابو: "تاریخ ادب اردو"، مترجمہ مرزا محمد عسکری، لکھنؤ، منشی نول کشور پریس۔

۶- " : " ، مرتبہ: مرتضیٰ فاضل حسین لکھنوی، لاہور، ولی سنز۔

۷- " : " ، مقدمہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز۔

۸- " : " ، مرتبہ: تبسم کاشمیری: لاہور، علمی کتاب خانہ، ۱۹۸۱ء۔

۹- " : " ، مرتبہ: قیوم نظامی، طبع اول، لاہور، گلوب پبلیشرز، ۱۹۸۶ء۔

۱۰- شمس اللہ قادری، حکیم: "اردوئے قدیم"، طبع دوم، لکھنؤ، نول کشور پریس، ۱۹۳۰ء۔

۱۱- عبادت بریلوی، ڈاکٹر: "اردو تنقید کا ارتقا"، طبع سوم، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۸۰-۱۹۷۹ء۔

۲ - غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر: "محاسن خطوطِ غالب"، طبع اول، لاهور، مکتبۂ خیابان ادب، ۱۹۶۹ء۔
۱۳- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: "اردو کی منظوم داستانیں"، طبع اول، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۱ء۔
۱۴- گیان چند جین، ڈاکٹر: "اردو کی منظوم داستانیں"، طبع دوم، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۶۹ء۔
۱۵- مخمور اکبرآبادی: "صحیفۂ تاریخ"، آگرہ، گیا پرشاد اینڈ سنز، ۱۹۳۶ء۔

رسائل

۱- سہ ماہی، اردو، اورنگ آباد، دکن، انجمن ترقی اردو، بابت اکتوبر ۱۹۲۹ء۔
۲- ادبی دنیا، لاهور، بابت، دسمبر ۱۹۴۰ء۔
۳- ماهنامہ مشرب، کراچی، تاریخ ادب نمبر، بابت جون، جولائی، ۱۹۵۶ء۔
۴- معارف، اعظم گڑھ، جلد ۲۷، اپریل ۱۹۳۰ء۔